منتخب غزلیں، نظمیں

احمد فراز سے وصی شاہ تک

حمیدی
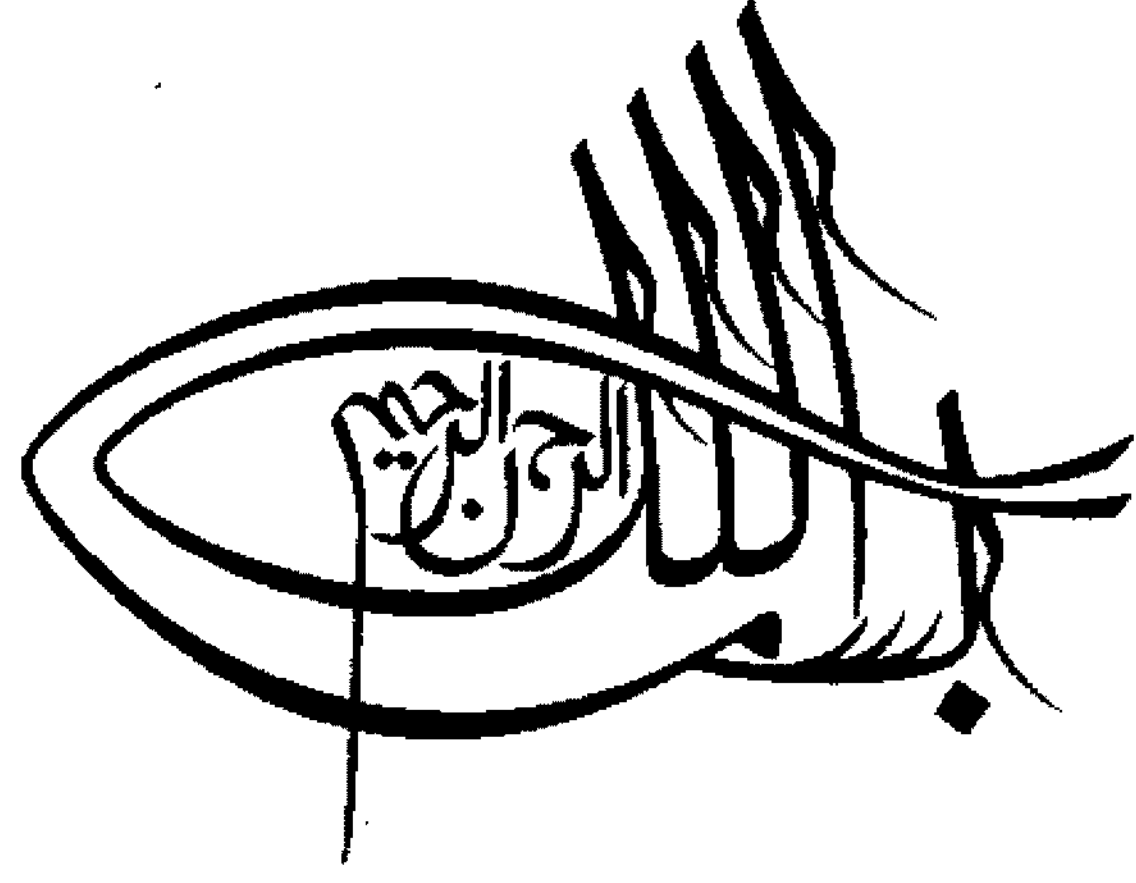
احمد فراز سے وصی شاہ تک

مرتب

حسن عباسی

نستعلیق مطبوعات

اسلم کولسری

کے نام

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝

القرآن

اشاعت اوّل : جنوری ۲۰۰۵ء

سرورق : نوید عباسی

کتابت : ورڈز میکر لاہور

ناشر : حسن محمود

مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

قیمت : 130 روپے

بیرون ملک : 10 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات

107 عرفان چیمبرز 130 ٹیمپل روڈ لاہور

0300-4489310 ، 0300-4616302 ، 042-7312745

E-mail nastalique@yahoo.com

ترتیب

رابطہ

حسن عباسی

107 عرفان چیمبرز 130 ٹیمپل روڈ لاہور

E-mail nastalique@yahoo.com

Cell 0300-4489310

احمد فراز

غزل

سُنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اس کی
سو ہم بھی اُس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات اُسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سیاہ چشم تو دیکھے ہیں پر نہ ایسے بھی
کہ اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اُسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گوہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشمِ تصور سے دشتِ امکاں میں
پلنگ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سرو قد ہے مگر بے گلِ مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

نظر اُٹھے تو یہ سمجھو کہ دین و دل تو گئے
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کے شبستاں سے متّصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں

رُکے تو گردشیں اُس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی، سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اُس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

احمد شمیم

ریت پر سفر کا لمحہ

کبھی ہم خوبصورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی!
بہت سے اَن کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دُور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دُور تھے
لیکن ہمارے پاس رہتے تھے!
نئے دن کی مسافت
جب کرن کے ساتھ آنگن میں اُترتی تھی
تو ہم کہتے تھے......امی
تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

مد مشتاق

غزل

مل ہی جائے گا کبھی، دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

جس کی سانسوں سے مہکتے تھے در و بام ترے
اے مکاں بول، کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

اِک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جُگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں، کون حسیں رہتا ہے

ابرار ندیم

غزل

مانا کہ اب وہ پہلی سی نسبت نہیں رہی
ایسا نہیں کہ تجھ سے محبت نہیں رہی

یوں تو کُھلے ہیں اب بھی کئی راستے مگر
اب واپسی کی کوئی بھی صورت نہیں رہی

تیرے بغیر مڑ کے کبھی دیکھ تو سہی
آنکھوں میں غم ہی غم ہے شرارت نہیں رہی

جلتے ہیں یوں تو اب بھی تری یاد کے چراغ
پہلے سی اِن میں دوست حرارت نہیں رہی

اتنے فریب کھائے ہیں اُلفت کے نام پر
اُلفت کے نام کی کوئی حسرت نہیں رہی

اختر شمار

غزل

اپنی باہوں کو ہم نے پتوار کیا تھا
تب جا کر وہ خون کا دریا پار کیا تھا

پتھر پھینک کے لوگوں نے جب عزت بخشی
ہم نے اپنے ہاتھوں کو دستار کیا تھا

کون سے خواب نے رات اپنی آنکھیں کھولی تھیں
کس کی خوشبو نے دل کو بیدار کیا تھا

اُس نے دِل پر قبضہ کیا' بن بیٹھا آمر
ہم نے جس کی شاہی سے انکار کیا تھا

بنتے گئے تھے اپنی ٹھوکر سے وہ رستے
جن رستوں کو تو نے کل دیوار کیا تھا

جن کو کبھی اِک آنکھ نہ ہم بھائے تھے اختر
ہم نے اُن کی نفرت سے بھی پیار کیا تھا

اختر حسین جعفری

محبت

تھا اُسے پیار میرے بچوں سے
اور مری آرزو میں دفن ہوئی
میں کہ زندہ تھا صرف اُس کے لئے
اب بھی زندہ ہوں اور وہ بچے
سوئی جاگی اُداس آنکھوں سے
گھر کے ویران صحن میں میرا
رات بھر انتظار کرتے ہیں
دور آنگن سے، کھل رہا ہے کہیں
''شاخِ تاریک پر سفید گلاب''

اعجاز توکل

غزل

دور رکھتے ہیں اُسے جس کو قریں جانتے ہیں
لوگ آدابِ شناسائی نہیں جانتے ہیں

یہ کوئی کم ہے ترے ہجر میں وحشت کا ثبوت
درد ہوتا ہے کہیں اور کہیں جانتے ہیں

ہم محبت میں رعایت کے نہیں ہیں قائل
جس جگہ ہوتا ہے جو اُس کو وہیں جانتے ہیں

وہ تو چپ چاپ چلا جاتا ہے اُٹھ کر لیکن
جو گزرتی ہے میاں ہم پہ ہمیں جانتے ہیں

یہ الگ بات نہ دے جیب اجازت ورنہ
گھر میں کیا چیز نہیں اتنا مکیں جانتے ہیں

ہم ہیں بینائی سے محروم مرے دوست سو ہم
جو بھی ہو پاؤں تلے اس کو زمیں جانتے ہیں

اسلم انصاری

محبت کے دنوں کی یاد میں ایک نظم

بہت مدت ہوئی
جب میری آنکھیں خواب بنتی تھیں
وہ اِک ہجراں زدہ عہدِ بہاراں تھا
مجھے پھولوں بھری راہیں بلاتی تھیں
مگر میں ایک نوکِ خار کی گہری چبھن کو
حاصلِ ہستی سمجھتا تھا!
تمہیں نامہرباں کہتے نہ تھکتا تھا
بہت دن تک تمہیں بے مہری ایام کا پیکر سمجھتا تھا
میں اس شائستہ اندازِ تکلم کو
صریحاً سنگدل، مغرور لہجہ ہی سمجھتا تھا
تمہاری تمکنت میں عجز کی جو رمز تھی
اس کو نہ سمجھا تھا!
ہواؤں سے اُلجھتا، موسموں کی دین سے انکار کرتا
میں تمہیں الزام دیتا تھا
وہ سب اشجار جن کی مہرباں چھاؤں

مجھے تسکینِ جاں کا اَن سنا پیغام دیتی تھی
مجھے کیکٹس سے بدتر تھے!
وہ ساری دلکشا راہیں، جو منزل کا اشارہ تھیں
مجھے اُلجھی ہوئی پگڈنڈیوں کا جال لگتی تھیں
(کہ تم نامہرباں تھیں میں سمجھتا تھا)

مگر میں اب یہ کہتا ہوں......
نہیں، تم مہرباں ہی تھیں
تم اپنی روح کی گہرائیوں میں خوبصورت تھیں
تم اپنی روح کی گہرائیوں میں اب بھی ویسی خوبصورت ہو
تمہارے دلنشیں لہجے میں جو آواز گاتی ہے
کسی بے مہر کے ہونٹوں پہ کیسے ناچ سکتی ہے؟
نہیں..........تم مہرباں ہی تھیں!

اسلم کولسری

غزل

ہجر کے جنگل میں آئی ہے پہلی رات درختو
کتنا سناٹا ہے چھیڑو کوئی بات درختو

ساری عمر کھڑے رہتے ہو تم باہیں پھیلائے
کب اور کس جانب سے آتی ہے خیرات درختو

گہری شام ہو، اور نہ کوئی پنچھی لوٹ کے آئے
کیسے ظاہر کرتے ہو اپنے جذبات درختو

سہمے سہمے سینوں میں طوفان تو اُٹھتے ہوں گے
پت جھڑ میں جب جھڑتے ہی جاتے ہیں پات درختو

تم کو رونا آتا ہو گا اپنی خاموشی پر
جب انسان لگاتے ہیں ٹہنوں پر گھات درختو

جان سے بھی پیارے اپنوں کے بیگانہ پن جیسی
کیا تم پر بھی اُترا کرتی ہیں آفات درختو

چور، شکاری، لکڑا ہارا، سادھو، جوگی، شاعر
کون تمہارے ہاں سے لوٹا خالی ہات درختو

اچھا یہ نوکیلے کانٹے ہیں یا ساکت چیخیں
اور یہ رنگیں پھول ہیں یا جامد جذبات درختو

میں نے کتنی باتیں کی ہیں لیکن تم نہیں بولے
ہاں ہاں کیا اسلم، کیا اسلم کی اوقات درختو

اطہر نفیس

غزل

اِک صورت دل میں سمائی ہے، اِک شکل ہمیں پھر بھائی ہے
ہم آج بہت سرشار سہی، پر اگلا موڑ جدائی ہے

پھر بادِ صبا کے جھونکے نے اِک درد جگایا سینے میں
اِک پھول کھلایا دامن میں، اِک خوشبو دل میں بسائی ہے

وہ اگلا موڑ جدائی کا، اُسے آنا ہے، وہ تو آئے گا
مگر آج تو اپنی راہوں میں بے مثل چمن آرائی ہے

اے دیدہ ورو، اے خوش نظرو، ذرا دیکھو تو اُس کافر کو
کیا سج دھج ہے، کیا تیور ہیں، کیا حُسن ہے، کیا زیبائی ہے

کچھ ہم سے زیادہ مدح سرا ہے رنگ شفق ان ہونٹوں کا
اور بادِ صبا اس سے بھی سوا ان زلفوں کی سودائی ہے

اِک عمر کے اس سناٹے میں بیدار ہوئی کیا صبحِ طرب
اس عرصہ گہہ تنہائی میں کیا شامِ تمنا آئی ہے

افتخار عارف

غزل

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

میں اس سے جھوٹ بھی بولوں تو مجھ سے سچ بولے
مرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو

میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو مری پستیوں کا ساتھی ہو

وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی مری رسوائیوں کا ساتھی ہو

کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو مرے تیوروں کا ساتھی ہو

میں اپنے آپ کو دیکھوں، وہ مجھ کو دیکھے جائے
وہ میرے نفس کی گمراہیوں کا ساتھی ہو

وہ خواب دیکھے تو دیکھے مرے حوالے سے
مرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو

امجد اسلام امجد

محبت کی ایک نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دلگیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمہارے قدموں میں آ گرے تو
یہ جان لینا
وہ استعارہ تھا میرے دِل کا
اگر نہ آئے؟
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اُس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا

میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمہیں ملوں گا
اگر ستاروں میں اوس قطروں میں خوشبوؤں میں
نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی سلگ چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رُک کے تم کو صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو
تو اس جزیرے پہ بھی اُترنا!!

انور شعور

غزل

اتفاق اپنی جگہ، خوش قسمتی اپنی جگہ
خود بناتا ہے جہاں میں آدمی اپنی جگہ

کہہ تو سکتا ہوں مگر مجبور کر سکتا نہیں
اختیار اپنی جگہ ہے، بے بسی اپنی جگہ

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ

صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

دوست کہتا ہوں تمہیں، شاعر نہیں کہتا شعور
دوستی اپنی جگہ ہے، شاعری اپنی جگہ

ایوب خاور

غزل

سات سُروں کا بہتا دریا، تیرے نام
ہر سُر میں ہے رنگ دھنک کا، تیرے نام

جنگل جنگل اُڑنے والے سب موسم
اور ہوا کا سبز دوپٹہ، تیرے نام

ہجر کی شام، اکیلی رات کے خالی در
صبح فراق کا زرد اُجالا، تیرے نام

تیرے بنا جو عمر بتائی بیت گئی
اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

ان شاعر آنکھوں نے جتنے رنگ چنے
ان کا عکس ہے میرا چہرہ، تیرے نام

دکھ کے گہرے، نیلے سمندر میں خاور
اس کی آنکھیں ایک جزیرہ، تیرے نام

باقی احمد پوری

غزل

دشت و دریا کے یہ اُس پار کہاں تک جاتی
گھر کی دیوار تھی، دیوار کہاں تک جاتی

مٹ گئی حسرتِ دیدار بھی رفتہ رفتہ
ہجر میں حسرتِ دیدار کہاں تک جاتی

تھک گئے ہونٹ ترا نام بھی لیتے لیتے
ایک ہی لفظ کی تکرار کہاں تک جاتی

لاج رکھنا تھی مسیحائی کی ہم کو، ورنہ
دیکھتے لذتِ آزار کہاں تک جاتی

راہبر اُس کو سرابوں میں لئے پھرتے تھے
خلقتِ شہر تھی بیمار کہاں تک جاتی

ہر طرف حسن کے بازار لگے تھے باقی
ہر طرف چشمِ خریدار کہاں تک جاتی

بشیر بدر

غزل

آنکھوں میں رہا دل میں اُتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اِک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اُس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

بیدل حیدری

غزل

ہم کبھی شہرِ محبت جو بسانے لگ جائیں
کبھی طوفان کبھی زلزلے آنے لگ جائیں

کبھی اک لمحۂ فرصت جو میسر آ جائے
میری سوچیں مجھے سولی پہ چڑھانے لگ جائیں

رات کا رنگ کبھی اور بھی گہرا ہو جائے
کبھی آثارِ سحر کے نظر آنے لگ جائیں

انتظار اس کا نہ اتنا بھی زیادہ کرنا
کیا خبر برف پگھلنے میں زمانے لگ جائیں

آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں تجھے دن میں ہم لوگ
شب کو کاغذ پہ ترا چہرہ بنانے لگ جائیں

ہم لکھاری بھی عجب ہیں کہ بیاضِ دل پر
خود ہی اِک نام لکھیں خود ہی مٹانے لگ جائیں

گھر میں بیٹھوں تو اندھیرے مجھے نوچیں بیدلؔ
باہر آؤں تو اُجالے مجھے کھانے لگ جائیں

پروین شاکر

اتنا معلوم ہے!

اپنے بستر پہ بہت دیر سے میں نیم دراز
سوچتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں پر ہو گا
میں یہاں ہوں مگر اُس کوچۂ رنگ و بو میں
روز کی طرح سے وہ آج بھی آیا ہو گا
اور جب اُس نے وہاں مجھ کو نہ پایا ہو گا؟

آپ کو علم ہے، وہ آج نہیں آئی ہیں؟
میری ہر دوست سے اُس نے یہی پوچھا ہو گا
کیوں نہیں آئی وہ کیا بات ہوئی ہے آخر
خود سے اس بات پہ سو بار وہ اُلجھا ہو گا
کل وہ آئے گی تو میں اُس سے نہیں بولوں گا

آپ ہی آپ کئی بار وہ روٹھا ہو گا
وہ نہیں ہے تو بلندی کا سفر کتنا کٹھن
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے یہ سوچا ہو گا
راہداری میں، ہرے لان میں، پھولوں کے قریب
اُس نے ہر سمت مجھے آن کے ڈھونڈا ہو گا

نام بھولے سے جو میرا کہیں آیا ہو گا
غیر محسوس طریقے سے وہ چونکا ہو گا
ایک جملے کو کئی بار سنایا ہو گا
بات کرتے ہوئے سو بار وہ بھولا ہو گا
یہ جو لڑکی نئی آئی ہے، کہیں وہ تو نہیں
اُس نے ہر چہرہ یہی سوچ کے دیکھا ہو گا
جانِ محفل ہے، مگر آج، فقط میرے بغیر
ہائے کس درجہ بھری بزم میں تنہا ہو گا
کبھی سناٹوں سے وحشت جو ہوئی ہو گی اُسے
اُس نے بے ساختہ پھر مجھ کو پکارا ہو گا
چلتے چلتے کوئی مانوس سی آہٹ پا کر
دوستوں کو بھی کسی عذر سے روکا ہو گا
یاد کر کے مجھے، نم ہو گئی ہوں گی پلکیں
"آنکھ میں پڑ گیا کچھ" کہہ کے یہ ٹالا ہو گا

اور گھبرا کے کتابوں میں جو لی ہو گی پناہ
ہر سطر میں مرا چہرہ اُبھر آیا ہو گا
جب ملی ہو گی اسے میری علالت کی خبر
اُس نے آہستہ سے دیوار کو تھاما ہو گا
سوچ کر یہ، کہ بہل جائے پریشانی دل
یونہی بے وجہ، کسی شخص کو روکا ہو گا!

اتفاقاً مجھے اُس شام مری دوست ملی
میں نے پوچھا کہ سنو آئے تھے وہ؟ کیسے تھے؟
مجھ کو پوچھا تھا؟ مجھے ڈھونڈا تھا چاروں جانب
اُس نے اک لمحے کو دیکھا مجھے اور پھر ہنس دی
اس ہنسی میں تو وہ تلخی تھی کہ اس سے آگے
کیا کہا اُس نے — مجھے یاد نہیں ہے — لیکن
اتنا معلوم ہے، خوابوں کا بھرم ٹوٹ گیا!

پیرزادہ قاسم

غزل

بے دلی سے ہنسنے کو خوش دلی نہ سمجھا جائے
غم سے جلتے چہروں کو روشنی نہ سمجھا جائے

لاکھ خوش گماں دنیا، باہمی تعلق کو
دوستی کہے لیکن دوستی نہ سمجھا جائے

ہم تو بس یہ کہتے ہیں، روز جینے مرنے کو
آپ چاہے کچھ سمجھیں زندگی نہ سمجھا جائے

گاہ گاہ وحشت میں گھر کی سمت جاتا ہوں
اس کو دشت حیرت سے واپسی نہ سمجھا جائے

خاک کرنے والوں کی کیا عجیب خواہش ہے
خاک ہونے والوں کو خاک بھی نہ سمجھا جائے

ثروت حسین

غزل

بھر جائیں گے جب زخم تو آؤں گا دوبارا
میں ہار گیا جنگ، مگر دل نہیں ہارا

روشن ہے مری عمر کے تاریک چمن میں
اِس کنجِ ملاقات میں جو وقت گزارا

اپنے لیے تجویز کی شمشیر برہنہ
اور اس کے لیے شاخ سے اِک پھول اُتارا

کچھ سیکھ لو لفظوں کو برتنے کا سلیقہ
اس شغل میں گزرا ہے بہت وقت ہمارا

لب کھولے پری زاد نے آہستہ سے ثروتؔ
جوں گفتگو کرتا ہے ستارے سے ستارا

ثمینہ راجہ

اور اُس نے میرا ہاتھ تھاما

کوئی دوپہر تھی
ہواؤں کے رتھ پر
جب اس نے مرا ہاتھ تھاما
کسی نے نہ دیکھا
سرِ شام ساحل پہ
موجوں کی زد پر
جب اس نے مرا ہاتھ تھاما
کسی نے نہ دیکھا
اندھیرے میں اِک رات
نیندوں کی حد پر
جب اس نے مرا ہاتھ تھاما
کسی نے نہ دیکھا
مگر میں نے دیکھا

نہ آنکھوں میں چہرا
نہ ہونٹوں پہ وعدہ
نہ دل میں بھروسا

ثناء اللہ شاہ

غزل

ہوائیں سرد ہو جائیں یا لہجے برف ہو جائیں
ہم اُس کی یاد کی چادر کو خود پہ تان لیتے ہیں

اگر وہ روٹھ جاتا ہے ہماری جاں نکلتی ہے
یہ سانسیں جاری رکھنے کو ہم اُس کی مان لیتے ہیں

یہ ہم درویش لوگوں کی کوئی دُنیا نہیں ہوتی
ملے جو خاک رستے میں ہم اُس کو چھان لیتے ہیں

یہ ہر سو دُھند کے منظر تو پہلے صاف ہونے دو
یہ چالیں جس نے کھیلی ہیں ہم اُس کو جان لیتے ہیں

ثنؔاء اب ایسا کرتے ہیں کوئی رستہ بناتے ہیں
زمانے سے بغاوت کی ابھی سے ٹھان لیتے ہیں

جاں نثار اختر

غزل

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایا کوئی لہرائے' تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے' لچک جائے' تو لگتا ہے کہ تم ہو

رستے کے دھندلکے میں کسی موڑ پہ کچھ دور
اِک لو سی چمک جائے تو لگتا ہوے کہ تم ہو

صندل سے مہکتی ہوئی پر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے' تو لگتا ہے کہ تم ہو

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے' تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب رات گئے کوئی کرن' میرے برابر
چپ چاپ سی سو جائے' تو لگتا ہے کہ تم ہو

جمال احسانی

غزل

عشق میں خود سے محبت نہیں کی جا سکتی
پر کسی کو یہ نصیحت نہیں کی جا سکتی

کیسے وہ بستیاں آباد کریں گے جن سے
در و دیوار کی عزت نہیں کی جا سکتی

کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جا سکتی

طائرِ یاد کو کم تھا شجرِ دل ورنہ
بے سبب ترکِ سکونت نہیں کی جا سکتی

اِک سفر میں کوئی دو بار نہیں لٹ سکتا
اب دوبارہ تری چاہت نہیں کی جا سکتی

کوئی ہو بھی تو ذرا چاہنے والا تیرا
راہ چلتوں سے رقابت نہیں کی جا سکتی

آسماں پر بھی جہاں لوگ جھگڑتے ہوں جمال
اس زمیں کے لیے ہجرت نہیں کی جا سکتی

جون ایلیا

غزل

نیا اِک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

خموشی سے ادا ہو رسمِ دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفا داری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

وفا، اخلاص، قربانی، مروّت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم

سنا دیں عصمتِ مریم کا قصہ؟
پر اب اس باب کو وا کیوں کریں ہم

زلیخائے عزیزاں بات یہ ہے
بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم

ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم
تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم

کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم

اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم

جو اِک نسل فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم

نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دُنیا کی پروا کیوں کریں ہم

برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم

ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی
سو خود پر بھی بھروسہ کیوں کریں ہم

پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

حبیب جالبؔ

غزل

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اِک جہاں چھوڑے آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت، وہ سماں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھی وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

چلے آئے ان رہگزاروں سے جالبؔ
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

حسن عباسی

غزل

مرتی ہوئی زمیں کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے

وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے

بھولے سے میری سمت کوئی دیکھتا نہ تھا
چہرے پہ ایک زخم لگانا پڑا مجھے

اس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فروخت بھی
اُس گھر کی دیکھ بھال کو جانا پڑا مجھے

اُس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے

ایسے بچھڑ کے اُس نے تو مر جانا تھا حسنؔ
اُس کی نظر میں خود کو گرانا پڑا مجھے

حسنین سحر

غزل

اب راہِ دُرست ان کو دکھا دیں تو رُلا دیں
اِک عمر کے بھٹکوں کو صدا دیں تو رُلا دیں

ہنستی ہوئی خلقت میں ہی موجود ہیں لیکن
گر حالِ دلِ زار سنا دیں تو رُلا دیں

بچوں نے بنا ڈالے ہیں کھلتے لب و رُخسار
اس شکل پہ آنکھیں جو بنا دیں تو رُلا دیں

تسلیم کی عادت بھی ہے، کچھ خوئے انا بھی
محبوسِ شبِ غم کو ہوا دیں تو رُلا دیں

سب اشک بہا آئے ہیں ہم اپنی طرف سے
اب آپ کی مرضی ہے رُلا دیں تو رُلا دیں

آنکھوں میں جو اُمید لیے آئیں سرِ شام
دُکان پسِ شام بڑھا دیں تو رُلا دیں

خالد احمد

غزل

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

حالات کے طلسم نے پتھرا دیا، مگر
بیتے سموں کی یاد میں کھویا نہ تو نہ میں

ہر چند اختلاف کے پہلو ہزار تھے
وا کر سکا مگر لبِ گویا نہ تو نہ میں

نوحے فصیلِ ضبط سے اونچے نہ ہو سکے
کُھل کر دیارِ سنگ میں رویا نہ تو نہ میں

جب بھی نظر اُٹھی تو فلک کی طرف اُٹھی
برگشتہ آسماں سے گویا نہ تو نہ میں

خالد شریف

کسی کمزور لمحے میں

کسی کمزور لمحے میں
اگر میں تم سے یہ کہہ دوں
"مجھے تم سے محبت ہے"
تو تم اس واقعے کو زیست کا عنواں نہ کر لینا
یہی کرنا کہ بس اک مسکراہٹ
اپنے رُخساروں پہ بکھرا کر
ذرا دھیمے سے لہجے میں
یہ کہہ دینا
"مجھے تم سے محبت ہے"
مگر اس واقعے کو زیست کا عنواں نہ کر لینا
کسی کمزور لمحے میں

خورشید رضوی

غزل

جب کبھی خود کو یہ سمجھاؤں کو تو میرا نہیں
مجھ میں کوئی چیخ اٹھتا ہے، نہیں، ایسا نہیں

وارداتِ دل کا قصّہ ہے غمِ دنیا نہیں
شعر تیری آرسی ہے، میرا آئینہ نہیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اِس گلی کے دوسری جانب کوئی رستا نہیں

تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اِس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

یوں تراشوں گا غزل میں تیرے پیکر کے نقوش
وہ بھی دیکھے گا تجھے جس نے تجھے دیکھا نہیں

اُن سے مل کر بھی کہاں مٹتا ہے دل کا اضطراب
عشق کی دیوار کے دونوں طرف سایا نہیں

ڈاکٹر کوثر محمود

کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

کچھ اپنے رنگ بکھرنے دو
کچھ اپنی خوشبو بکھراؤ
اور شیریں شبنمی لہجے میں کوئی نرم ملائم بات کرو
جس لمحے میں موجود ہیں ہم یہ لمحہ موج ہے ساگر کی
تم اس لمحے کے ساتھ رہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

تاریخ کے جبر کی بات ہی کیا
ہم دونوں کی اوقات ہی کیا
کچھ رُوپ کا سونا دان کرو، خیرات اپنی مسکان کرو
ہم جیسے شاعر لوگوں کا جینا مرنا آسان کرو
صندل سی باہیں پھیلاؤ، کچھ نظمیں غزلیں دے جاؤ
جو شاید باقی رہ جائیں

پھر دو سو سال کے بعد کوئی نقاش کمال فن کر دے
اپنی ہر پور قلم کر دے
اور راج کٹاس کے پتھر پر
اِک لوک روایت نقش کرے
ہم دونوں کو تمثیل کرے، آئینہ عکس پہ عکس کرے
جس عکس پہ خوشبو لہرائے، جس نقش پہ تتلی رقص کرے

پھر ایک ہزار برس گزریں، پھر چار ہزار برس گزریں
آثار شناسی کے ماہر اس دور کی جب تحقیق کریں
اِس رسم الخط کو پہچانیں، اس لمحے کی تصدیق کریں
یہ لمحہ قائم دائم ہو
اس لمحے کی سب کو ملتا اُس عہد کے شاعر تک پہنچے
یہ قصہ آخر تک پہنچے
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو
کوئی کیا جانے، لمحہ بھر میں، یہ لمحہ اپنے ساتھ نہ ہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

راشدامین

غزل

ایک تصویر جو کمرے میں لگائی ہوئی ہے
گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار چھپائی ہوئی ہے

ڈھول کا شور قیامت ہے کہ تیری بارات
دوسرے گاؤں سے اس گاؤں میں آئی ہوئی ہے

آنکھ پر شیشہ لگایا ہے کہ محفوظ رہے
تیری تصویر جو پانی میں بنائی ہوئی ہے

تخت اور تاج تو پاؤں میں پڑے رہتے ہیں
وہ گدائی ترے درویش نے پائی ہوئی ہے

قبر پر دیپ نہ رکھ نام کا کتبہ نہ لگا
ہم نے مشکل سے یہ تنہائی کمائی ہوئی ہے

راشدہ اُداس

غزل

آیا ترا خیال بڑی مدتوں کے بعد
پوچھا کسی نے حال بڑی مدتوں کے بعد

لکھتا تو ہے وہ خط مجھے چاہت بھرا مگر
ہوتا ہے یہ کمال بڑی مدتوں کے بعد

آئی ہے آج یاد بھی تیری ہوا کے ساتھ
اوڑھی ہے غم کی شال بڑی مدتوں کے بعد

اُس کو جواب دینے کی جلدی مجھے ہے کیوں
جس نے کیا سوال بڑی مدتوں کے بعد

لکھا ہے اُس نے خط میں کہ آؤں گا اگلے سال
گزرے گا اب یہ سال بڑی مدتوں کے بعد

ترکِ تعلقات میں اِس کا ہے دُکھ اُداس
ہم کو ہوا ملال بڑی مدتوں کے بعد

رام ریاض

غزل

کسی نے دور سے دیکھا، کوئی قریب آیا
امیرِ شہر میں جب بھی کوئی غریب آیا

ہوا میں زہر گھلا، پانیوں میں آگ لگی
تمہارے بعد زمانہ بڑا عجیب آیا

بریدہ دست، برہنہ بدن، شکستہ پا
ترے دیار میں کیا کیا نہ بدنصیب آیا

کسی کو اب نہ ستائے گی مرگِ نامعلوم
چراغِ دار جلے، موسمِ صلیب آیا

برس مہینوں میں، ہفتے دنوں میں ڈھلنے لگے
جو رام دُور تھا، وہ وقت اب قریب آیا

رشید قیصرانی

غزل

میرے لیے تو حرفِ دُعا ہو گیا وہ شخص
سارے دکھوں کی جیسے دوا ہو گیا وہ شخص

میں آسماں پہ تھا تو زمیں کی کشش تھا وہ
اُترا زمین پر تو ہوا ہو گیا وہ شخص

سوچوں بھی اب اُسے تو تخیل کے پر جلیں
مجھ سے جدا ہوا تو خدا ہو گیا وہ شخص

سب اشک پی گیا مرے اندر کا آدمی
میں خشک ہو گیا ہوں، ہرا ہو گیا وہ شخص

میں اُس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً
سمٹا، سمٹ کے رنگِ حنا ہو گیا وہ شخص

پھرتا ہے لے کے آنکھ کا کشکول در بدر
دل کا بھرم لٹا تو گدا ہو گیا وہ شخص

پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کر اُسے رشید
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص

ریحانہ روحی

غزل

سفر میں رستہ بدلنے کے فن سے واقف ہے
وہ شخص چہرہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

غرورِ فتح میں مت بھولنا کہ دوسری سمت
غنیم دستہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

عجیب تجربہ گذرا کہ دشتِ غربت میں
شجر بھی سایہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

ہوئی ہے چشم شناسا بھی اجنبی تو کھلا
کہ آنکھ رشتہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

سنی سنائی پہ اِک دم یقین مت کرنا
یہ خلق قصہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

اُسی کے پاس حکومت ہے اب قبیلے کی
کہ جو قبیلہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

کسی کو پنجرہ بدلنے کا شوق ہے روحیؔ
کوئی پرندہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

سعد اللہ شاہ

غزل

ہم کہ چہرے پہ نہ لائے کبھی ویرانی کو
کیا یہ کافی نہیں ظالم تری حیرانی کو

کارِ فرہاد سے یہ کم تو نہیں جو ہم نے
آنکھ سے دِل کی طرف موڑ دیا پانی کو

شیشۂ شوق پہ تو سنگِ ملامت نہ گرا
عکسِ گل رنگ ہی کافی ہے گراں جانی کو

دامنِ چشم میں تارا ہے نہ جگنو کوئی
دیکھ اے دوست مری بے سروسامانی کو

تو رُکے یا نہ رُکے فیصلہ تجھ پر چھوڑا
دل نے در کھول دیے ہیں تری آسانی کو

ہاں مجھے خبط ہے سودا ہے جنوں ہے شاید
دے لو جو نام بھی چاہو مری نادانی کو

سعود عثمانی

غزل

حسابِ ترکِ تعلق تمام میں نے کیا
شروع اُس نے کیا اختتام میں نے کیا

وہ چاہتا تھا کہ دیکھے مجھے بکھرتے ہوئے
سو اس کا جشن بصد اہتمام میں نے کیا

بہت دنوں میں مرے گھر کی خامشی ٹوٹی
خود اپنے آپ سے اِک دن کلام میں نے کیا

اس ایک ہجر نے ملوا دیا وصال سے بھی
کہ تو گیا تو محبت کو عام میں نے کیا

چلی جو سیلِ رواں پر وہ کاغذی کشتی
تو اس سفر کو محبت کے نام میں نے کیا

وہ آفتاب جو دل میں دہک رہا تھا سعودؔ
اسے سپردِ شفق آج شام میں نے کیا

سلیم احمد

غزل

عشق میں جس کے یہ احوال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

حالِ دل کون سنائے اسے، فرصت کس کو
سب کو اس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

اے صبا! آ کہ دکھائیں تجھے وہ گل جس نے
باتوں ہی باتوں میں گلزار کھلا رکھا ہے

دیکھ اے دل، نہ کہیں بات یہ اس تک پہنچے
چشمِ نمناک نے طوفان اُٹھا رکھا ہے

حُسن چاہے جسے ہنس بول کے اپنا کر لے
دل نے اپنوں کو بھی بیگانہ بنا رکھا ہے

دل جو اس بزم میں آتا ہے تو جاتا ہی نہیں
ایک دن دیکھنا، دیوانہ ہوا رکھا ہے

تیرے آنے کی خبر پا کے ابھی سے دل نے
شکوہ کو اور کسی دن پہ اُٹھا رکھا ہے

دشت و در خیر منائیں کہ ابھی وحشت میں
عشق نے پہلا قدم نامِ خدا رکھا ہے

ہجر میں رنج بھی کرتے ہیں پہ اتنا بھی سلیم
یار تو نے تو عجب حال بنا رکھا ہے

سلیم کوثر

محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے

محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے
جس میں تم لکھو
کہ کل کس رنگ کے کپڑے پہننے کون سی خوشبو لگانی ہے
کسے کیا بات کہنی، کون سی کس سے چھپانی ہے
کہاں کس پیڑ کے سائے تلے ملنا ہے
مل کر پوچھنا ہے
کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے
یہ فرسودہ سا جملہ ہے
مگر پھر بھی یہی جملہ
دریچوں، آنگنوں، سڑکوں، گلی کوچوں میں چوباروں میں
چوباروں کی ٹوٹی سیڑھیوں میں

ہر جگہ کوئی کسی سے کہہ رہا ہے
کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے
محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے
جس میں تم لکھو
تمہیں کس وقت، کس سے کس جگہ ملنا ہے کس کو چھوڑ جانا ہے
کہاں پر کس طرح کی گفتگو کرنی ہے یا خاموش رہنا ہے
کسی کے ساتھ کتنی دُور تک جانا ہے اور کب لوٹ آنا ہے
کہاں آنکھیں ملانا ہے کہاں پلکیں جھکانا ہے
یا یہ لکھو کہ اب کی بار جب وہ ملنے آئے گا
تو اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر
دھنک چہرے پہ روشن جگمگاتی رقص کرتی اُس کی آنکھوں میں اُتر جائیں گے
اور پھر گلشن وصحرا کے بیچوں بیچ دل کی سلطنت میں خاک اُڑائیں گے
بہت ممکن ہے وہ عجلت میں آئے
اور تم اُس کا ہاتھ ہاتھوں میں نہ لے پاؤ
نہ آنکھوں ہی میں جھانکو اور نہ دل کی سلطنت کو فتح کر پاؤ
جہاں پر گفتگو کرنی ہے تم خاموش ہو جاؤ
جہاں خاموش رہنا ہے وہاں تم بولتے جاؤ
نئے کپڑے پہن کر گھر سے نکلو، میلے ہو جاؤ
کوئی خوشبو لگانے کا ارادہ ہو تو شیشی ہاتھ سے گر جائے

تم ویران ہو جاؤ
سفر کرنے سے پہلے بے سروسامان ہو جاؤ
محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے آب جو ہے
جو دلوں کے درمیاں بہتی ہے خوشبو ہے
کبھی پلکوں پہ لہرائے تو آنکھیں ہنسنے لگتی ہیں
جو آنکھوں میں اُتر جائے تو منظر اور پس منظر میں شمعیں جلنے لگتی ہیں
کسی بھی رنگ کو چھو لے
وہی دل کو گوارا ہے
کسی مٹی میں گھل جائے
وہی مٹی ستارہ ہے

سلیم طاہر

غزل

یہ جو ایک دستِ سوال ہے ترے سامنے
کوئی غم سے کتنا نڈھال ہے ترے سامنے

میں پڑا ہوں قریۂ ہجر کے اسی کنج میں
مگر ایک شہرِ وصال ہے ترے سامنے

یہاں عرضِ حال پہ کس کو اتنا عبور ہے
یہاں کس کی اتنی مجال ہے ترے سامنے

میں دیا جلا کے منڈیر پر نہیں رکھ سکا
تو ہوا ہے جلنا محال ہے ترے سامنے

مرے آئینے مری عاجزی سے کلام کر
ترا ایک واقفِ حال ہے ترے سامنے

سلیم گورمانی

غزل

کوئی بات بھی نہیں سوجھتی، کوئی کام بھی نہیں سوجھتا
ہے عجیب کیفیت اِن دنوں، ترا نام بھی نہیں سوجھتا

کوئی کیف ہے نہ کوئی کسک، ہوئی کیسی زندگی بے نمک
کسی سانولی کا خیال تک، سرِ شام بھی نہیں سوجھتا

کئے سجدے سینکڑوں خواب میں، جسے پوجا ہم نے غیاب میں
وہ ہے اتفاق سے سامنے، تو سلام بھی نہیں سوجھتا

دھری رہ گئی ہیں فصاحتیں، کسی کام کی نہ بلاغتیں
بحضورِ یار سخن وروں کو کلام بھی نہیں سوجھتا

سرِ جوئے بار جو سیر کو، نکل آئے آئینہ رو مرا
تو سلیم بہتی ہوئی ندی کو خرام بھی نہیں سوجھتا

سہیل احمد خان

ایک انتظار کرنے والی کی تصویر

پہلے بھورے بادل گذرے
پھر لاکھوں انسان
پھر اِک کالی آندھی آئی
پھر گرجا طوفان
خاک میں ملتے رہے زمانے
گرتے رہے مکان
وہ دہلیز پہ کھڑی ہے اب تک
اسی طرح حیران

سیّد امتیاز احمد

غزل

گو یاد میؔر جی کی نصیحت ہے کیا کریں
بے زور و زر ہیں اور محبت ہے کیا کریں

ہم لوگ صرف عشق ہی کرتے ہیں' چھوڑ دیں؟
چھوڑا' اور اب جو اتنی فراغت ہے کیا کریں

کم حوصلہ نہیں ترے جاں داد گاں مگر
اب زندہ رہنا بھی تو مصیبت ہے کیا کریں

ہم جانتے ہیں ہم سے برا کوئی بھی نہیں
پر یہ جو ہم کو اچھوں سے نسبت ہے کیا کریں

آخر کو ہم نے دعویٰ فقر و غنا کیا
بے چارگی کا نام قناعت ہے کیا کریں

سیّد مبارک شاہ

محبت میں ایک مشورہ

دوبارہ اِس سے ملنے کا
یقیں رکھ کر
بس اپنی ذمہ داری پر جدا ہونا
محبت میں بچھڑتے دم
خدا حافظ نہیں کہتے

شاہین مفتی

اُسے جانے کی جلدی تھی

یونہی باتوں ہی باتوں میں
مجھے اُس نے بتایا تھا
محبت کرنے والے پیار میں دھوکا نہیں کرتے
کوئی جب بات کرتا ہو اُسے ٹوکا نہیں کرتے
جسے جانے کی جلدی ہو اُسے روکا نہیں کرتے
یونہی باتوں ہی باتوں میں
مجھے اَب یاد آیا ہے
اُسے جانے کی جلدی تھی

شبنم شکیل

غزل

سوکھے ہونٹ، سلگتی آنکھیں، سرسوں جیسا رنگ
برسوں بعد وہ دیکھ کے مجھ کو رہ جائے گا دنگ

ماضی کا وہ لمحہ مجھ کو آج بھی خون رُلائے
اُکھڑی اُکھڑی باتیں اُس کی غیروں جیسے ڈھنگ

تارا بن کر دور اُفق پر کانپے، لرزے، بولے
کچی ڈور سے اُڑنے والی دیکھو ایک پتنگ

دِل کو تو پہلے درد کی دیمک چاٹ گئی تھی
روح کو بھی اب کھاتا جائے تنہائی کا زنگ

سب کچھ دے کے ہنس دی اور پھر کہنے لگی تقدیر
کبھی نہ ہو گی پوری تیرے دِل کی ایک اُمنگ

شبنم کوئی جو تجھ سے ہارے جیت پہ مان نہ کرنا
جیت وہ ہو گی جب جیتو گی اپنے آپ سے جنگ

شکیب جلالی

غزل

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے، سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

برا نہ مانیئے لوگوں کی عیب جوئی کا
انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو
وہ دُور کوئی جزیرا دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی
زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے

کھلی ہے دل میں کسی کے بدن کی دھوپ شکیب
ہر ایک پھول سنہرا دکھائی دیتا ہے

شہزاد احمد

غزل

جس سے تو بات کرے جو ترا چہرہ دیکھے
پھر اُسے شہر نظر آئے نہ صحرا دیکھے

روشنی وہ ہے کہ آنکھیں نہیں کھُلنے پاتیں
اب تو شاید ہی کوئی ہو جو اُجالا دیکھے

اس بھرے شہر میں کس کس سے کہوں حال اپنا
میری حالت تو کوئی دیکھنے والا دیکھے

دیکھتا رہتا ہوں میں نقشِ کفِ پا کی طرف
اور اگر میری طرف نقش کفِ پا دیکھے

چھوڑنے میں نہیں جاتا اُسے دروازے تک
لوٹ آتا ہوں کہ اب کون اسے جاتا دیکھے

عجب اِک خانہ خرابی ہے کہ یہ دل خود کو
رات بھر جمع کرے، صبح کو لٹتا دیکھے

سائے کی طرح مرے ساتھ ہے دنیا شہزادؔ
کیسے ممکن ہے کہ کوئی مجھے تنہا دیکھے

ظفر اقبال

غزل

دل کا یہ دشت عرصۂ محشر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں رات بڑا ڈر لگا مجھے

آگے بھی عشق میں ہوئیں رسوائیاں مگر
اب کے وفا کا زخم جبیں پر لگا مجھے

اے دل وہ مہرباں ہے یونہی بدگماں نہ ہو
مارا تھا اس نے غیر کو پتھر لگا مجھے

ہر سو ترے وجود کی خوشبو تھی خیمہ زن
وہ دن کہ اپنا گھر بھی ترا گھر لگا مجھے

ہنس کر نہ ٹال جا کہ یہ اُمید کی کرن
وہ تیر ہے کہ سینے کے اندر لگا مجھے

تاریکی حیات کا اندازہ کر کہ آج
داغِ شکست مہر منور لگا مجھے

سانچے تو تھے غزل کے سوا بھی مگر ظفرؔ
کیا جانے کیوں یہ ظرف حسیں تر لگا مجھے

عبدالحمید عدمؔ

غزل

میکدہ تھا، چاندنی تھی، میں نہ تھا
اک مجسم بے خودی تھی، میں نہ تھا

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
وہ مری دیوانگی تھی ، میں نہ تھا

وہ حسیں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذتِ ہمسائیگی تھی ، میں نہ تھا

مے کدے کے موڑ پر رُکتی ہوئی
مدتوں کی تشنگی تھی ، میں نہ تھا

میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی ، میں نہ تھا

گیسوؤں کے سائے میں آرام کش
سر برہنہ زندگی تھی ، میں نہ تھا

دیر و کعبہ میں عدمؔ حیرت فروش
دو جہاں کی بدظنی تھی ، میں نہ تھا

عبیداللہ علیم

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں
یہ میرا چہرہ' یہ میری آنکھیں
بجھے ہوئے سے چراغ جیسے
جو پھر سے جلنے کے منتظر ہوں
وہ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں
جنہوں نے پیاں کیے تھے مجھ سے
رفاقتوں کے' محبتوں کے
کہا تھا مجھ سے کہ اے مسافر رہِ وفا کے
جہاں بھی جائے گا ہم بھی آئیں گے ساتھ تیرے
بنیں گے راتوں میں چاندنی ہم تو دن میں سائے بکھیر دیں گے
وہ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں
وہ اپنے پیاں رفاقتوں کے محبتوں کے
شکست کر کے
نہ جانے اَب کس کی رہ گزر کا منارہ روشنی ہوئے ہیں
مگر مسافر کو کیا خبر ہے

وہ چاند چہرہ تو بجھ گیا ہے
ستارہ آنکھیں تو سو گئی ہیں
وہ زُلفیں بے سایہ ہو گئی ہیں
وہ روشنی اور وہ سائے میری عطا تھے
سو میری راہوں میں آج بھی ہیں
کہ میں مسافر رہِ وفا کا
وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں
ہزاروں چہروں ہزاروں آنکھوں
ہزاروں زلفوں کا ایک سیلابِ تند لے کر
مرے تعاقب میں آ رہے ہیں
ہر ایک چہرہ ہے چاند چہرہ
ہیں ساری آنکھیں ستارہ آنکھیں
تمام ہیں،
مہربان سایہ دار زُلفیں
میں کس کو چاہوں، میں کس کو چوموں
میں کس کے سائے میں بیٹھ جاؤں
بچوں کہ طوفاں میں ڈوب جاؤں
کہ میرا چہرہ، نہ میری آنکھیں
مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

عدیم ہاشمی

غزل

آنکھوں میں آنسوؤں کو اُبھرنے نہیں دیا
مٹی میں موتیوں کو بکھرنے نہیں دیا

جس راہ پر پڑے تھے ترے پاؤں کے نشاں
اس راہ سے کسی کو گزرنے نہیں دیا

ہر بار ہے نیا ترے ملنے کا ذائقہ
ایسا ثمر کسی بھی شجر نے نہیں دیا

یہ ہجر ہے تو اس کا فقط وصل ہے علاج
ہم نے یہ زخم وقت کو بھرنے نہیں دیا

اتنے بڑے جہان میں جائے گا تو کہاں
اس اِک خیال نے مجھے مرنے نہیں دیا

اُس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
میں نے عدیم اس کو مکرنے نہیں دیا

عزیر احمد

غزل

ایسے اس کا چہرہ باتیں کرتا ہے
جیسے صبح کا تارا باتیں کرتا ہے

جب بھی اس کے پہلو میں آ بیٹھتا ہوں
گھنٹوں مجھ سے دریا باتیں کرتا ہے

پچھلی رات کو شہر کی سونی گلیوں میں
کہتے ہیں اِک سایہ باتیں کرتا ہے

میں نے بولنا جس کو سکھایا تھا کل تک
اب تو وہ بھی کیا کیا باتیں کرتا ہے

ایسے بولتا رہتا ہے وہ شخص عذیرؔ
جیسے کوئی جھرنا باتیں کرتا ہے

عرش صدیقی

اُسے کہنا

اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اِک اور ماضی کی گپھا میں ڈوب جائے گا
اُسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے گا
اُسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے کہرے دیواروں میں لرزاں ہیں
اُسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں
اور ان پر برف کی چادر بچھی ہے
اُسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی!
اُسے کہنا کہ لوٹ آئے!!

عرفان صادق

غزل

شجر، زمین، گھٹا، آسمان بولتا ہے
وہ ہونٹ کھولے تو سارا جہان بولتا ہے

سنے گا کون صدائیں دلِ شکستہ کی
تمام شہر تمہاری زبان بولتا ہے

ہمارے بیچ محبت مہک رہی ہے اگر
تو پھر یہ کون ہے جو درمیان بولتا ہے

دِلوں سے اُٹھتا نہیں خوف کا دھواں یونہی
یقیں بکھرنے لگے تو گمان بولتا ہے

جلائے بیٹھا ہوں جب سے دیے منڈیروں پر
ہر ایک شخص ہوا کی زبان بولتا ہے

ضروری ہو گیا ہے اب تو بولنا عرفان
سکوتِ شب ہو تو خالی مکان بولتا ہے

عرفان صدیقی

غزل

ہم بندگاں تو نذرِ وفا ہونے والے ہیں
پھر آپ لوگ کس کے خدا ہونے والے ہیں

اِک روز آسماں کو بھی تھکنا ضرور ہے
کب تک زمیں پہ حشر بپا ہونے والے ہیں

ہم پہلے تشنگی کی حدوں سے گذر تو جائیں
سارے سراب آبِ بقا ہونے والے ہیں

لگتا نہیں ہے دل کو جفا کا کوئی جواز
نا مہرباں، یہ تیر خطا ہونے والے ہیں

ہم دل میں لکھ رہے ہیں حسابِ ستم گراں
کچھ دن میں سب کے قرض ادا ہونے والے ہیں

ان راستوں میں دل کی رفاقت، ہے اصل چیز
جو صرف ہم سفر ہیں جدا ہونے والے ہیں

اچھا نہیں غزل کا یہ لہجہ مرے عزیز
بس چپ رہو کہ لوگ خفا ہونے والے ہیں

عطاء الحق قاسمی

ایک فلرٹ لڑکی

مجھ کو اپنا کہتی تھی
مجھ سے بھی وہ ملتی تھی
اُس کے ہونٹ گلابی تھے
اُس کی آنکھ میں مستی تھی
میں بھی بھولا بھٹکا سا
وہ بھی بھولی بھٹکی تھی
شہر کی ہر آباد سڑک!
اُس کے گھر کو جاتی تھی!

لیکن وہ کیا لڑکی تھی!
لڑکی تھی کہ پہیلی تھی!
اُلٹے سیدھے رستوں پر
آنکھیں ڈھانپ کے چلتی تھی
بھیگی بھیگی راتوں میں
تنہا تنہا روتی تھی
میلے میلے کپڑوں میں
اُجلی اُجلی لگتی تھی
اُس کے سارے خواب نئے
اور تعبیر پرانی تھی

علی محمد فرشی

میں کب لکھوں گا گیت اپنی رہائی کا

وہ کہتی ہے
مجھے تم سے محبت ہے
وہ سچ کہتی ہے...... سچ کہتی رہے گی
ازل کے اوّلیں دن سے وہ سچ کہتی رہی ہے
ابد کی آخری شب تک وہ سچ کہتی رہے گی
مجھے دیوار پر اُس نے وہاں ٹانکا ہوا ہے
جہاں سے دیکھ سکتا ہوں
زمیں کے اُس طرف پھیلی گھنیری، سرمئی تنہائیاں
جو خود اُس نے کبھی تحریر کی ہوں گی
ازل سے تا ابد پھیلے خلا پر
مگر جب سے وہ خود اپنی خبر میں ہے
اُسے دیوار کی اُس دوسری جانب کی کوئی بھی خبر اچھی نہیں لگتی
خبر نے اُس کو کیسا بے خبر رکھا ہوا ہے

اِدھر دیوار کو
(دیوار کے پیچھے کھڑی تنہائیوں کی)
باخبر لمبی زبانیں
چاٹ کر کاغذ بنانے کے عمل میں ہیں
میں اس کاغذ پہ کب لکھوں گا
گیت اپنی رہائی کا

غلام محمد قاصر

غزل

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے

خارِ چمن تھے شبنم شبنم، پھول بھی سارے گیلے تھے
شاخ سے ٹوٹ کے گرنے والے پتے پھر بھی پیلے تھے

سرد ہواؤں سے تو تھے ساحل کی ریت کے یارانے
لو کے تھپیڑے سہنے والے صحراؤں کے ٹیلے تھے

تابندہ تاروں کا تحفہ صبح کی خدمت میں پہنچا
رات نے چاند کی نذر کیے جو تارے کم چمکیلے تھے

سارے سپیرے ویرانوں میں گھوم رہے ہیں بین لیے
آبادی میں رہنے والے سانپ بڑے زہریلے تھے

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانہ کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

کون غلام محمد قاصر بے چارے سے کرتا بات
یہ چالاکوں کی بستی تھی اور حضرت شرمیلے تھے

فرحت عباس شاہ

محبت بھی کچھ ایسی

مجھے خود سے محبت ہے
محبت بھی کچھ ایسی
جو کسی صحرا کو بارش سے
کہ بارش جس قدر بھی ٹوٹ کر برسے
ذرا پل بھر کو پیاسی ریت کے لب بھیگ جاتے ہیں مگر
بس اِک ذرا پل بھر
مجھے خود سے محبت ہے
محبت بھی کچھ ایسی
جو پرندوں کو فضاؤں سے
گلوں کو خوشبوؤں سے
منظروں کو لہلہاتے موسموں سے
جس میں چھونے، جذب رکھنے اور کا مل لے ہمیشہ
مسکرانے کے لیے
دل چاہتوں اور خواہشوں کی سب حدوں کو پار کر جائے

مجھے خود سے محبت ہے مگر
اتنی نہیں جتنی مرے سودائی کو مجھ سے
وہ اپنے رات اور دن، دھوپ چھاؤں، ساحلوں
دریا کناروں کو
فقط اِک میرے نقطے میں سمیٹے
اور میری چاہتوں میں
آنکھ سے دِل، روح سے وجدان کی ہر کیفیت میں ڈوبتا
روتا اُبھرتا مسکراتا
ذات اور معروض کے سارے حوالوں سے کبھی کا کٹ چکا ہے
اور مجھے اُس سے محبت ہے
محبت بھی کچھ ایسی
جو کسی صحرا کو بارش سے

فہمیدہ ریاض

برف باری کی رُت

یہیں تو کہیں پر
تمہارے لبوں نے
مرے سرد ہونٹوں سے برفیلے ذرّے چنے تھے
اسی پیڑ کی چھال پر ہاتھ رکھ کر
ہم اِک دن کھڑے تھے
یہیں برفباری میں ہم لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے
مہک تازہ بوسوں کی سر میں سمائے
ہم آغوشی جسم و جاں کے نشے میں
گئی برفباری کی رُت
اور پگھلتی ہوئی برف بھی بہہ گئی سب
یہاں کچھ نہیں اب
کہ ہر شے نئی ہے
ہٹا کر ردا برف کی گھاس لہرا رہی ہے
ہری پتیوں کی گھنی ٹہنیوں میں
ہوا جب چلے تو
گئے موسموں سے گزرتی
ہماری ہنسی گونجتی ہے

قتیل شفائی

غزل

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے

وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے

میں اپنے دل سے نکالوں خیال کس کس کا
جو تو نہیں تو کوئی اور یاد آئے مجھے

میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیلؔ
غمِ زمانہ سے کہہ دو خرید لائے مجھے

قمر رضا شہزاد

غزل

میں نے بھی تہمتِ تکفیر اُٹھائی ہوئی ہے
ایک نیکی مرے حصے میں بھی آئی ہوئی ہے

میرے کاندھے پہ دھرا ہے کوئی ہارا ہوا عشق
یہی گٹھڑی ہے جو مدت سے اُٹھائی ہوئی ہے

تم تو آئے ہو ابھی دشتِ محبت کی طرف
میں نے یہ خاک بہت پہلے اُڑائی ہوئی ہے

ٹوٹ جاؤں گا اگر مجھ کو بنایا بھی گیا
کوئی شے ایسی مری جاں میں سمائی ہوئی ہے

سرد مہری کے علاقے میں ہوں مصروفِ دعا
زندہ رہنے کے لیے آگ جلائی ہوئی ہے

قصہ گو اب تری چوپال سے میں جاتا ہوں
رات بھی بھیگ چکی نیند بھی آئی ہوئی ہے

گلِ نوخیز اختر

غزل

خاک پر مہربان ہوتے تھے
ہم کبھی آسمان ہوتے تھے

آپ میں دھوپ آ گئی کیسے
آپ تو سائبان ہوتے تھے

اب تو اشجار بحث کرتے ہیں
پہلے یہ بے زبان ہوتے تھے

دشت' دریا' پہاڑ اور جنگل
سب مرے میزبان ہوتے تھے

ہم نے بھی خط سنبھال رکھے ہیں
ہم بھی آخر جوان ہوتے تھے

لطیف ساحل

غزل

جو بات بات پہ تکرار کرنے والا تھا
وہ شخص مجھ کو بہت پیار کرنے والا تھا

تری سواری تلے آ کے مر گیا ہے جو
ترا قریب سے دیدار کرنے والا تھا

تمہی نے مان لیا میری بے گناہی کو
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

خطا یہی ہے کہ چھپ چھپ کے تیرا نام لیا
یہ جرم تو سرِ بازار کرنے والا تھا

اُداس لوگوں کی تیمار داری کرتے تھے
یہ مشغلہ ہمیں بیمار کرنے والا تھا

میں خود بھی کھو گیا خوابوں کے سحر میں ساحل
اُسے میں نیند سے بیدار کرنے والا تھا

لیاقت علی عاصم

غزل

یہاں رہنا معطّل کرنے والا تھا کہ تم آئے
میں دروازہ مقفّل کرنے والا تھا کہ تم آئے

تمہاری آہٹوں نے لو بچائی میری آنکھوں کی
میں خود کو خود سے اوجھل کرنے والا تھا کہ تم آئے

تمہارے نام کی ہچکی تھی ہونٹوں پر سمٹنے کو
میں سنّاٹا مکمل کرنے والا تھا کہ تم آئے

چھتوں پر لوگ ہوتے اور میرا رقصِ تنہائی
مجھے یہ چاند پاگل کرنے والا تھا کہ تم آئے

بہت بے سایہ و بے آب لگتی تھی زمینِ دل
سو اِک آنسو کو بادل کرنے والا تھا کہ تم آئے

بلا کر اِک نئے شاداب چہرے کو میں کھڑکی میں
پرانا مسئلہ حل کرنے والا تھا کہ تم آئے

مجید امجد

بُندا

کاش میں تیرے بن گوش میں بُندا ہوتا!

رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں
تو ترے کان سے چپ چاپ نکل جاتا میں
صبح کو گرتے تری زُلفوں سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا مُلول
تو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہُوئے بستر کی ہر اک سلوٹ میں
جونہی کرتیں تری نرم انگلیاں محسوس مجھے
ملتا اس گوش کا پھر گوشۂ مانوس مجھے
کان سے تو مجھے ہرگز نہ اُتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
یوں تری قربتِ رنگیں کے نشے میں مدہوش
عمر بھر رہتا مری جاں میں ترا حلقہ بگوش

کاش میں تیرے بن گوش میں بُندا ہوتا!

محبوب خزاں

اتنا حسن کیا کرو گے؟

چتونیں رجھانے والی
سادگی ستانے والی
ہر ادا لبھانے والی
کون سی ادا کرو گے
اتنا حسن کیا کرو گے

یہ جو لوگ ہیں بچارے
اپنی بے کسی کے مارے
سب اسیر ہیں تمہارے
کس طرح وفا کرو گے
اتنا حسن کیا کرو گے

اب چھری ہے یا گلا ہے
دل کشی بری بلا ہے
یہ بدن کدھر چلا ہے
جاگتے رہا کرو گے
اتنا حسن کیا کرو گے

محسن احسان

غزل

شاخِ مژگانِ محبت پہ سجا لے مجھ کو
برگِ آوارہ ہوں صرصر سے بچا لے مجھ کو

رات بھر چاند کی ٹھنڈک میں سلگتا ہے بدن
کوئی تنہائی کے دوزخ سے نکالے مجھ کو

میں تری آنکھ سے ڈھلکا ہوا اِک آنسو ہوں
تو اگر چاہے بکھرنے سے بچا لے مجھ کو

شب غنیمت تھی کہ یہ زخم نظارہ تو نہ تھا
ڈس گئے صبحِ تمنا کے اُجالے مجھ کو

میں منقش ہوں تری روح کی دیواروں پر
تو مٹا سکتا نہیں' بھولنے والے مجھ کو

تہہ بہ تہہ موجِ طلب کھینچ رہی ہے محسنؔ
کوئی گردابِ تمنا سے نکالے مجھ کو

محسن بھوپالی

غزل

چاہت میں کیا دنیا داری، عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا، سمجھانے دو، ان کی اپنی مجبوری

میں نے دل کی بات رکھی اور تو نے دنیا والوں کی
میری عرض بھی مجبوری تھی ان کا حکم بھی مجبوری

روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو تم روکو
کچی مٹی تو مہکے گی، ہے مٹی کی مجبوری

ذات کدے میں پہروں باتیں اور ملیں تو مہر بلب
جبر وقت نے بخشی ہم کو اب کے کیسی مجبوری

جب تک ہنستا گاتا موسم اپنا ہے، سب اپنے ہیں
وقت پڑے تو یاد آ جاتی ہے مصنوعی مجبوری

مدت گزری اِک وعدے پر آج بھی قائم ہیں محسن
ہم نے ساری عمر نباہی اپنی پہلی مجبوری

محسن نقوی

غزل

وہ جس کا نام بھی لیا پہیلیوں کی اوٹ میں
نظر پڑی تو چھپ گئی سہیلیوں کی اوٹ میں

رُکے گی شرم سے کہاں یہ خال و خد کی روشنی
چھپے گا آفتاب کیا ہتھیلیوں کی اُوٹ میں

ترے مرے ملاپ پر وہ دشمنوں کی سازشیں
وہ سانپ رینگتے ہوئے چنبیلیوں کی اوٹ میں

وہ تیرے اشتیاق کی ہزار حیلہ سازیاں
وہ میرا اضطراب یار بیلیوں کی اوٹ میں

چلو کہ ہم بجھے بجھے سے گھر کا مرثیہ کہیں
وہ چاند تو اُتر گیا حویلیوں کی اوٹ میں

محمد اظہار الحق

غزل

میں وہم بیچتا ہوں' وسوسے بناتا ہوں
ستارے دیکھتا ہوں' زائچے بناتا ہوں

گراں ہے اتنا تو کیوں وقت ہو مجھے درکار
مزے سے بیٹھا ہوا بلبلے بناتا ہوں

مسافروں کا مرے گھر ہجوم رہتا ہے
میں پیاس بانٹتا ہوں آبلے بناتا ہوں

خرید لاتا ہوں پہلے ترے وصال کے خواب
پھر ان سے اپنے لیے رت جگے بناتا ہوں

یہی نہیں کہ زمینیں مری اچھوتی ہیں
میں آسمان بھی اپنے نئے بناتا ہوں

مقصود وفا

غزل

تمہارے ہجر کا انجام خوبصورت ہے
بہت اُداس مگر شام خوبصورت ہے

تو جس طرح سے حسیں ہے زمانے بھر سے الگ
اُسی طرح سے ترا نام خوبصورت ہے

پھر اُس کے بعد یہ رستہ کدھر کو جاتا ہے
یہ زندگی تو کوئی گام خوبصورت ہے

نہیں ضروری کہ ہر بات کی وضاحت ہو
کہیں کہیں پہ یہ ابہام خوبصورت ہے

میں اس لئے نہیں دیتا صفائی اپنی وفا
مرے حریف کا الزام خوبصورت ہے

منصور آفاق

غزل

تیرا چہرہ کیسا ہے، میرے دھیان کیسے ہیں
یہ بغیر تاروں کے بلب آن کیسے ہیں

خواب میں اُسے ملنے کھیت میں گئے تھے ہم
کارپٹ پہ جوتوں کے یہ نشان کیسے ہیں

بولتی نہیں ہے جو وہ زبان کیسی ہے
یہ جو سنتے رہتے ہیں میرے کان کیسے ہیں

روکتے ہیں دُنیا کو میری بات سننے سے
لوگ میرے بارے میں بدگمان کیسے ہیں

کیا ابھی نکلتا ہے ماہتاب گلیوں میں؟
کچھ کہو میانوالی آسمان کیسے ہیں؟

کیا ابھی محبت کے گیت ریت گاتی ہے؟
تھل کی سسی کیسی ہے، پنوں خان کیسے ہیں؟

کیا قطار اونٹوں کی چل رہی ہے صحرا میں؟
گھنٹیاں سی بجتی ہیں، ساربان کیسے ہیں؟

چمنیوں کے ہونٹوں سے کیا دھواں نکلتا ہے؟
خالی خالی، برسوں کے وہ مکان کیسے ہیں؟

دیکھتا تھا رِم جھم سی بیٹھ کر جہاں تنہا
لان میں وہ رنگوں کے سائبان کیسے ہیں؟

اب بھی وہ پرندوں کو کیا ڈراتے ہیں منصورؔ؟
کھیت کھیت لکڑی کے بے زبان کیسے ہیں؟

منصورہ احمد

یاد ہے؟

یاد ہے اِک پورن ماشی میں
چاند ہمارے کتنے پاس اُتر آیا تھا
ہم سے کتنی باتیں کی تھیں
اپنے رتھ پر کتنی سیر کرائی تھی
پگھلی پگھلی کرنوں سے اِک محل سجا کر
ہم کو کتنے چاؤ سے اپنا مہمان بنایا تھا
اب بھی چاند مری دُنیا میں آ جاتا ہے
حیراں حیراں آنکھوں سے تکتا رہتا ہے
اور جیسے کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے
اگلی پورن ماشی پر تم ایسا کرنا
پل دو پل کو ہی آ جانا
چاند کی اُنگلی تھام کے اپنے گھر لے جانا

منیر سیفی

غزل

آنکھ سمندر، آنسو دریا بن سکتا ہے
جیسا چاہو گھر کا نقشہ بن سکتا ہے

تم کو دیکھنے سے پہلے کب یہ سوچا تھا
اِک چہرہ بھی پوری دنیا بن سکتا ہے

اسکی خوشبو جذب اگر شعروں میں کرلوں
میرا نام بھی ایک حوالہ بن سکتا ہے

شہر بدر ہو جانے سے کیوں گھبراتے ہو
ہم دونوں سے ایک قبیلہ بن سکتا ہے

سب آثار، سبھی اطوار وہیں جیسے ہیں
خیر سے میرا شہر بھی کوفہ بن سکتا ہے

منیر نیازی

محبت اب نہیں ہو گی

ستارے جو دمکتے ہیں
کسی کی چشم حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمالِ ابرو باراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں
دلِ ناشاد میں ہو گی
محبت اب نہیں ہو گی
یہ کچھ دن بعد میں ہو گی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہو گی

نجیب احمد

غزل

بدن سے جاں نکلنا چاہتی ہے
بلا اب سر سے ٹلنا چاہتی ہے

یونہی آتش فشاں کب جاگتے ہیں
زمیں کروٹ بدلنا چاہتی ہے

حدِ صحنِ گلشن سے نکل کر
صبا گلیوں میں چلنا چاہتی ہے

دھواں سا اُٹھ رہا ہے چار جانب
کوئی صورت نکلنا چاہتی ہے

ہواؤں میں نہیں قوت نمو کی
مگر ٹہنی تو پھلنا چاہتی ہے

جو چہرہ ہے وہاں، پھولی ہے سرسوں
زمیں سونا اگلنا چاہتی ہے

نصیر احمد ناصر

اَبد کے اُس طرف بھی فاصلے ہیں

مسافر ہوں
ترے شہرِ محبت میں ذرا سی دیر ٹھہروں گا
چلا جاؤں گا اپنے راستے پر
زندگی کی رات ڈھلنے دے
بدن کو مات ہونے دے
رُکی ہے جو لبوں پر بات ہونے دے
ترا شہرِ محبت خوب ہے لیکن اسیری کا بہانہ ہے
ازل کی اوّلیں ساعت، ابد کا آخری لمحہ
یہیں پر مرتکز سارا زمانہ ہے
مگر مجھ کو فصیلِ وقت کے
ٹھہرے ہوئے اس دائرے کو پار کرنا ہے
ابد کی سرحدوں سے دُور آگے
لاجوردی روشنی سے پیار کرنا ہے

ترا شہرِ محبت تو مرا پہلا پڑاؤ ہے
جسے تو آخری منزل سمجھتی ہے
دلوں کے راستوں پر وہ
فقط اِک نیم روشن سا الاؤ ہے
بڑی لمبی مسافت ہے، بڑا گہرا یہ گھاؤ ہے
ابد کے اس طرف بھی راستے ہی راستے ہیں
فاصلوں کا ایک نادیدہ بہاؤ ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں
جسے میں چھو بھی سکتا ہوں
مگر میں تو مسافر ہوں
ترے شہرِ محبت میں ذرا سی دیر ٹھہروں گا..........

نوشی گیلانی

اختیار

ہوا کو لکھنا جو آ گیا ہے
اب اُس کی مرضی کہ وہ خزاں کو بہار لکھ دے
بہار کو انتظار لکھ دے
سفر کی خواہش کو واہموں کے عذاب سے
ہم کنار لکھ دے
وفا کے رستوں پہ چلنے والوں کی قسمتوں میں
غبار لکھ دے

ہوا کو لکھنا جو آ گیا ہے
ہوا کی مرضی کہ وصل موسم میں ہجر کو حصہ دار لکھ دے
محبتوں میں گزرنے والی رُتوں کو ناپائیدار لکھ دے
شجر کو بے سایہ دار لکھ دے
ہوا کو لکھنا جو آ گیا ہے
اب اس کی مرضی کہ وہ ہمارے دیئے بجھائے
شبوں کو بااختیار کر کے سحر کو بے اعتبار لکھ دے
ہوا کو لکھنا سکھانے والو
ہوا کو لکھنا جو آ گیا ہے

وصی شاہ

کنگن

کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا
تو بڑے پیار سے چاؤ سے بڑے مان کے ساتھ
اپنی نازک سی کلائی میں چڑھاتی مجھ کو
اور بے تابی سے فرقت کے خزاں لمحوں میں
تو کسی سوچ میں ڈوبی جو گھماتی مجھ کو
میں ترے ہاتھ کی خوشبو سے مہک سا جاتا
جب کبھی موڈ میں آ کر مجھے چوما کرتی
تیرے ہونٹوں کی میں حدت سے دہک سا جاتا
رات کو جب بھی تو نیندوں کے سفر پر جاتی
مرمریں ہاتھ کا اِک تکیہ بنایا کرتی
میں ترے کان سے لگ کر کئی باتیں کرتا
تیری زلفوں کو ترے گال کو چوما کرتا
جب بھی تو بندِ قبا کھولنے لگتی جاناں
اپنی آنکھوں کو ترے حُسن سے خیرہ کرتا
مجھ کو بے تاب سا رکھتا تری چاہت کا نشہ

میں تری روح کے گلشن میں مہکتا رہتا
میں ترے جسم کے آنگن میں کھنکتا رہتا
کچھ نہیں تو یہی بے نام سا بندھن ہوتا
کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا